نئی صدی کے اردو ناولوں میں پاکستانیت

(تخصیصی مطالعہ)

1۔ڈاکٹر رحمت علی شادؔ
پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز کمیر ٹاؤن ساہیوال
2۔ثمینہ کوثر (ایم فل اردو)

Abstract:

Mirza Athar Baig, Hassan Manzar and Mustansar Hussain Tarrard are well known Urdu novelists who are prolifically writing in 21st century too. It is quite natural that the age of the writer is depicted in his works. Islamic values, religious traditions and diverse culture and civilization are important parts of Pakistani society. The above mentioned novelists' writings exhibit the diverse colours of Pakistani life and society. In their works we also find the comparison of western and eastern civilizations. Their novels also show the rebellious characters who go against the principles of islamic values and Pakistani civilization. Culture and civilization, stark realities of life, aspects of Pakistani life, the development and problems of 21st century are the common features found in novels of these writers.

Keywords:

اکیسویں صدی، پاکستانیت، اردو ناول، اطہر بیگ، حسن منظر، مستنصر حسین تارڑ، مغربی تہذیب، اسلامی اقدار، مشرقی روایات، استحصال

ناول انسانی زندگی کا بھرپور مطالعہ ہے۔ یہ زندگی کے اہم واقعات کا بیان ہی نہیں بل کہ حقیقت کی ایسی سچی تصویر ہے جس میں ناول نگار کے تجربے اور خواب ہم آہنگ ہو کر قوسِ قزح کا منظر پیش

کرتے ہیں۔ناظر جب اس تصویر کو دیکھتا ہے تو کچھ دیر کے لیے اس کے پس منظر میں کھو جاتا ہے پھر کچھ مسائل کبھی تارے، کبھی چاند اور کبھی سورج بن کر اس کے سامنے ابھرتے ہیں جن سے زندگی کی سچائی، تلخی اور کرب کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں؛اس طرح ناول زندگی کی تصویر ہی نہیں اس کی ہمہ رنگ تفسیر بھی ہے۔ناول کے متعلق ڈاکٹر مسیح الزماں اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"ناول میں زندگی کی عام حقیقتوں کی سچائیاں ایسے انداز میں واضح کی جاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو اور گہرا شعور ہو جائے۔اس کے کردار غور و فکر کے لیے زندگی کا ایسا قماش پیش کرتے ہیں جو زندگی کا مماثل نہیں بل کہ زندگی کی سچائیوں کا ترجمان ہے۔"(1)

ہر اچھے ناول کی پہچان اس کی حقیقت نگاری ہے۔اس میں حقیقی زندگی اور سچے واقعات کو پیش کرنا چاہیے؛جو زندگی کے ارتقا اور انقلاب کی تصویر کشی کریں۔سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"انسانی زندگی کے ارتقا اور انقلاب کی ہی تصویر کشی جو افسانوی رنگ میں ظاہر ہو ناول کہلاتی ہے۔"(2)

اگر اردو ناول کا ارتقائی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہمارے ناولوں میں زندگی اور سماج کی کسی نہ کسی حد تک عکاسی کی گئی ہے چوں کہ انسانی تہذیب اور اس کی اقدار تغیر پذیر ہیں اس لیے ہم انھیں آج کے پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے۔اگر ہم ان ناولوں کے موضوعات کو اس عہد کے تقاضوں کے پس منظر میں دیکھیں گے تو ایسی صورت میں ناولوں کے اولین نقوش بھی عصری آب و رنگ کے حامل نظر آئیں گے۔

انگریزی میں اٹھارہویں صدی کے اوائل کا دور رومانٹک کہلاتا ہے۔اس دور میں والٹر سکاٹ، ولیم بلیک، ولیم ورڈز ورتھ، سموئل ٹیلر، کالرج، جان کیٹس وغیرہ شامل ہیں۔(1901ء-1837ء) وکٹورین ناول کا آغاز ہوتا ہے۔اس دور میں سماجی، اصلاحی سیاسی، صنعتی رجحان اور استحصال کے مو ضوع پر قلم اٹھایا گیا۔بیسویں صدی میں جیمز جوائس، ڈی ایچ لارنس، ورجینیا وولف(1941ء-1882ء)میں جدید ناول نگار کے طور پر منظرِ عام پر آئے۔کسی بھی ملک یا قوم کی تہذیب و تمدن کا اندازہ اس ملک میں بسنے والے لوگوں کی روایات،

تہذیب،زبان،خیالات،عقائد،اخلاقیات،رسومات،کام کرنے کے طریقے اور قانون سے لگایا جا سکتا ہے۔

پاکستان ایک نوزائیدہ ملک ہے۔ 1947ء سے قبل اقوامِ عالم میں اس کی کوئی آزادانہ شناخت نہ تھی۔یہ خطہ دنیا میں اپنی پوری تاریخ و تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے ہندوستان کہلاتا تھا لیکن پاکستانی قوم آج خود کو عالمی برادری کے باوقار رکن کے طور پر منوانا چاہتی ہے۔ ہمیں آزادی کی نعمت سے مستفید ہوئے تقریباً تہتر سال کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن افسوس کہ آج ہماری مقامی یا قومی سوچ؛ عالمی سطح کی قومیت کی کیفیت میں دب کر رہ گئی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں: "جب معاشرے میں دانشورانہ روایات ختم ہو جاتی ہیں تو معاشرہ بھی کھوکھلا ہو جاتا

ہر تہذیبی معاشرہ ایک خاص دور میں جنم لیتا ہے لہٰذا اس میں اس دور کی تہذیبی خاصیتیں، محلِ وقوع، آب وہوا، اس خطے کی طبعی خاصیتیں اور قدرتی پیداوار بھی اس پر اثرانداز ہوتی ہیں اور اس طرح معاشرہ میں مخصوص رجحانات وخیالات اور جسمانی وروحانی صلاحیتیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ اکیسویں صدی کے نمائندہ ناول نگار جنھوں نے تواتر سے لکھا ہے ان میں مرزا اطہر بیگ، حسن منظر اور مستنصر حسین تارڑ کے نام نمایاں ہیں؛اسی لیے سب سے پہلے ہم مرزا اطہر بیگ کے اہم ناولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ان کے ناول غلام باغ 2006ء، صفر سے ایک 2010ء اور حسن کی صورتِ حال ہے۔"(3)

"2014ء میں منظرِ عام پر آئے۔ مرزا اطہر بیگ کا پہلا ناول غلام باغ ہے جو معاشرتی تنوع کے حوالے سے خاصا اہمیت کا حامل ہے؛ جس میں مصنف نے ایلیٹ کلاس، مڈل کلاس اور لوئر کلاس کی معاشرتی زندگی کے متفرق پہلوؤں سے پردہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ مختلف مناظر کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ قاری خود کو اس مقام پر موجود پاتا ہے۔مذکورہ ناول میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بالخصوص پاکستانی معاشرے میں قربانی کا جذبہ نمایاں ہے؛ جہاں اپنی ضرورتوں پر دوسروں کو ترجیح دی جاتی ہے؛ جو اپنوں کے لیے سارا سارا دن دھوپ اور گرمی میں روزی روٹی کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں۔ مصنف غلام باغ میں ایک جگہ پر برادرانہ محبت کی مضبوط بنیادوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "مددعلی کی زندگی بس اتنی ہی تھی؛اس نے شادی بھی نہیں کی تھی اور اپنے بھائی عاشق علی کے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔عاشق علی عیال دار آدمی

اور کیفے غلام باغ میں بیروں کو زیادہ ٹِپ بھی مشکل سے ملتی تھی؛ چوں کہ مدد
علی اپنی ساری کمائی عاشق علی کے کنبے کے حوالے کر دیتا تھا؛ وہ اس لیے کہ
عاشق علی کے دل میں برادرانہ محبت کی بنیادیں بہت مضبوط تھیں۔"(4)

چوں کہ پاکستانی معاشرے کے لوگ ایک دوسرے سے منسلک نظر آتے ہیں اسی لیے المیہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے دفتری اور نجی معاملات میں ٹانگ اڑانا ان کا وطیرہ بن گیا ہے اور دوسروں کے متعلق طرح طرح کے گمان رکھنا بھی ایک عام روایت ہے؛ اس طرح کے طرزِ عمل سے بعض اوقات معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پاکستانی معاشرے کا یہ بھی ایک المیہ ہے کہ دوسروں کے لیے مشکلات اور مسائل پیدا کر کے کچھ لوگ خوش ہوتے ہیں۔ مذکورہ ناول میں مصنف در اصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو پریشان کر کے شاید وہ خوش رہیں گے تو یہ محض ان کا خیال ہوتا ہے دراصل وہ اندر سے خود پریشان ہوتے ہیں؛ ایسے لوگ حسد کی آگ میں نہ صرف خود جلتے ہیں بل کہ دوسروں کو بھی اس آگ میں جھلسانے کی کوشش کرتے ہیں؛ کوئی بھی پیشہ لے لیجیے تقریباً ہر جگہ طنزیہ مسکراہٹیں اور خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا لوگوں کی عام عادت بن چکی ہے۔

مرزا اطہر بیگ نے معاشرتی ناہمواریوں کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں پر نسل در نسل غلامی اور رسوائی کی زندگی گزارنے والے طبقے کی مصیبتوں اور دکھوں کو بھی بیان کیا ہے مثلاً غریبوں کے بچے اگر پڑھ بھی جاتے ہیں تو ان کو بھی اعلیٰ عہدے شاذونادر ہی ملتے ہیں لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے یعنی کوئی غریب آدمی کوئی ڈاکٹر یا انجینیر بن جائے تو عملی زندگی میں اسے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں کے ساتھ صدیوں تک رہنے کی وجہ سے ابھی بھی توہم پرستی کے اثرات ہمارے معاشرے میں نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں؛ ویسے تو معاشرتی توہم پرستی ہر معاشرے کا ہی حصہ ہے اور بالخصوص اس وقت جب انسان کو مکمل طور پر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگتا ہے اور زندگی سے مقابلے کی امید دم توڑتی نظر آنے لگتی ہے تو اس طرح وہ جلد بہکاوے میں آجاتا ہے۔ کبھی کسی مزار پر تو کبھی کسی پیر کے پاس؛ جہاں بھی اسے امید کی کرن نظر آتی ہے بغیر تصدیق کیے اسی طرف چل پڑتا ہے؛ خاص طور پر دیہاتوں میں ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی

زیادہ نمایاں ہے۔ دنیاوی اور دینی علم سے عاری معاشرت کی تو یہ ایک بڑی کمزوری ہے ہی لیکن بعض اوقات اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مرزا اطہر بیگ لکھتے ہیں:

"حاجت مند خوش عقیدہ لوگوں، آخری امید والوں، منتیں مرادیں ماننے والوں، آرزوئیں پوری ہونے پر چڑھاوے چڑھانے والوں اور معجزے پر ایمان کڑا کرنے والوں کا ہجوم تھا۔"(۵)

عدل وانصاف سے عاری لوگ

معاشرے کے لیے ناسور ہوتے ہیں۔ ان کے لگائے گئے گھاؤ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایک نیک اور شریف النفس انسان اپنی سچائی کا مدعا بیان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑے اور آخر کار وہ اس میں سرخرو بھی ہو جائے لیکن بدنامی کا لگا داغ اس کی ساری زندگی کے لیے ناسور بن جاتا ہے۔ ذلت اور رسوائی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو دنیا سے چھپاتا پھرتا ہے۔ آج دنیا اتنی ترقی یافتہ ہو گئی ہے لیکن معاشرتی اونچ نیچ ہر جگہ پر موجود ہے۔ زمانہ قدیم میں جاگیر دارانہ نظام موجود تھا؛ اتنی ترقی کے باوجود جہاں پر آج بھی آقا اور غلام کا تصور پایا جاتا ہے۔ غلاموں کے ساتھ آج بھی جانوروں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اتنے مہنگے عدل و انصاف تک رسائی نہ ہونے سے یہ لوگ نسل در نسل غلامی کی چکی میں پس رہے ہیں، آزادی کی خواہش اور اس کی کے خلاف جدوجہد معاشرت کی مثبت سوچ کی آئینہ دار ہے کہ معاشرتی سطح پر انسانی رویوں میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہونی چاہییں۔

"حسن کی صورتِ حال" مرزا اطہر بیگ کا دوسرا اہم ناول ہے؛ جس میں مصنف نے مرکزی کردار حسن کے ذریعے معاشرے کے مختلف واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس میں زیادہ تر درمیانے طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے۔ معاشرتی مرتبہ حاصل کرنے کے لیے انسان ساری زندگی انتہائی تگ و دو سے کام لیتا ہے۔ پاکستانی معاشرے کی ایک سوچ یہ بھی ہے کہ اچھے بینک بیلنس اور کوٹھی کے مالک شخص کی جھونپڑی میں رہنے والے مخلص اور غریب شخص سے زیادہ قدر کی جاتی ہے اور دوسری طرف جہالت اور پس ماندگی معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے پس منظر میں ایک فرد؛ تنہا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کیوں کہ یہاں پر معاشرتی انا کو ترجیح دی جاتی ہے چاہے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے؟ معاشرتی عزت و ناموس کی خاطر قتل کرنے سے بھی گریز نہیں

کیا جاتا اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں تو وہ معاشرے میں سر اٹھا کر نہیں چل سکیں گے ؛انھیں قدم بہ قدم پر طعنوں کا سامنا کرنا پڑے گا؛ ایسا ہی ایک واقعہ مرزا اطہر بیگ قلم بند کرتے ہیں:

"پندرہ سال پہلے اس کے بھائی اکرم نے جب اپنی بہن کو گاؤں کے ایک نوجوان کے ساتھ دیکھا تو غیرت میں دونوں کو قتل کیا۔ دونوں بھائی پکڑے گئے لیکن پھر اکرم جیل چلا گیا اور اشرف شہر میں اپنے صاحب کے گھر چلا گیا۔"(6)

مادہ پرستی اور لالچ یہ دو ایسی سماجی برائیاں ہیں جنھوں نے اپنے پرائے کی پہچان ختم کر دی ہے۔ خونی رشتوں کا احساس تک ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنی محنت و قسمت پر بھروسے کی بجائے دوسروں کی دولت پر لوگوں کی نگاہ ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ بھی ان کے پاس آجائے اور وہ راتوں رات امیر بن جائیں؛ یہ خود غرض لوگ ہوتے ہیں جو صرف اپنے مفادات کو عزیز رکھتے ہیں۔ اخلاقیات سے عاری یہ لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔

ہمارے سماج کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ کہیں پر حلال ذرائع سے دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے ایڑیاں رگڑنا پڑتی ہیں تو کہیں پر حرام ذرائع سے کوٹھیاں، کاریں دنوں میں خرید لی جاتی ہیں؛ کہیں پر امتحانات میں اچھے نمبر لینے کے لیے دن رات ایک کرنا پڑتا ہے تو کہیں پر ناجائز ذرائع سے بغیر محنت کیے پوزیشنز حاصل کر لی جاتی ہیں یعنی ہمارے ہاں اکثر جگہوں پر معاشرتی رویوں میں یک رنگی دکھائی نہیں دیتی۔

مذکورہ ناول "حسن کی صورتِ حال" میں کرداروں کے نام ایک ہی طرح کے ہیں لیکن ان کا زندگی کے مختلف شعبوں میں کام مختلف ہے۔ مصنف نے اس ناول میں عام معاشرتی مسائل سے پردہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ فلمی اور تھیٹر کے ماحول، اس کے مسائل، معاشرے پر اس کے منفی اثرات کو بیان کیا ہے۔ معاشرتی بے حسی اور قانون شکن عناصر کے عزائم سے پردہ اٹھایا ہے۔ مرزا اطہر بیگ اپنے ایک انٹرویو میں اپنے ناول "حسن کی صورتِ حال" کے بارے میں بتاتے ہیں:

"Hassan's state of affairs is the totality of situations denoting our historical civilizational creative and congitivie existence"(7)

اردو ادب کی ایک اور اہم تخلیقی شخصیت سید حسن منظر ہے جو 1934ء کو؛ ہاپڑا، اتر پردیش میں پیدا ہوئے، افسانوں کا پہلا مجموعہ "رہائی" 1982ء میں شائع ہوا۔ ایک اور تصنیف "خاک کا رتبہ" جسے 2007ء کی بہترین نثری کتاب کے طور پر مولوی عبد الحق قومی ایوارڈ دیا گیا متعدد تخلیقات کے علاوہ حسن منظر کے ناولوں میں "العاصفہ"، "دھنی بخش کے بیٹے"، "انسان، اے انسان" اور "وبا (ایک بیانیہ)" شامل ہیں۔ اکیسویں صدی کے نمایاں لکھاریوں میں سید حسن منظر کا نام بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

چوں کہ سید حسن منظر کا تعلق طب سے تھا اس لیے انھوں نے اپنی مختلف تحریروں میں طب سے متعلقہ بہت سے واقعات کو بیان کیا مثلاً ان کا ایک مختصر ناول "وبا" (ایک بیانیہ) ہے؛ جس کا آغاز وہ ماں کے رشتے سے کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ماں دنیا کا خوب صورت ترین رشتہ ہے کیوں کہ وہ اپنی اولاد سے بے پناہ اور بے لوث محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے نومولود جو کہ ایک گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے کو اپنے سینے سے لگاتی ہے۔ ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتی ہے۔ شدید موسم میں اسے سردی، گرمی سے بچاتی ہے تاکہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ مزدوری کرنے والی مائیں اپنی کمر پر اپنے بچے کو باندھ کر سارا دن مشقت کرتی ہیں اور بچے کا بوجھ بھی برداشت کرتی ہیں۔ جب ماں کو بچہ خوش نظر آتا ہے تو وہ اپنی محنت، مشقت، تھکاوٹ کو یکسر بھول جاتی ہے اور جب بچے کو تکلیف میں پاتی ہے تو راتیں جاگ کر گزار دیتی ہے۔ ماں کے حوالے سے ایسی ہی صورتِ حال کو حسن منظر بیان کرتے ہیں:

> "لیکن دو راتوں سے وہ سوئی ایک لمحے کو بھی نہیں ہے۔ نہیں معلوم جب بچہ گھر پر تھا کتنی راتیں پلکیں ایک دوسرے سے نہیں لگی تھیں۔" (۸)

حسن منظر کا دوسرا اہم ناول "دھنی بخش کے بیٹے" ہے؛ جس ناول میں انھوں نے دھنی بخش کے بیٹے کی صورت میں خالصتاً دیہی ماحول کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ آج اکیسویں صدی کا انسان ایک طرف چاند پر قدم رکھ چکا ہے تو دوسری طرف ہمارے معاشرے کے اندر وہی قدیم غاروں والی زندگی کا عکس نظر آتا ہے کیوں کہ لوگوں کو صحیح طریقے سے دین سے آگاہی ہے نہ ہی دنیا سے اور نہ ہی مذہبی فرائض کی ادائیگی کا مکمل شعور ہے اسی لیے ہمارے ہاں معاشرتی ناہمواریاں اور طرح طرح کی قباحتیں پائی جاتی ہیں جو کہ کسی طرح بھی اسلامی معاشرے کا شیوہ نہیں ہو سکتیں۔ ذات پات کی اونچ نیچ اور دنیاوی مادہ پرستی عام ہے۔ اکثریت کا تو زندگی کے متعلق کوئی نظریۂ حیات ہی

نہیں ہے۔ معیارِ زندگی انتہائی پست ہونے کے باوجود ان کے اندر کچھ کر گزرنے کی جستجو ہی نہیں ہے۔ مذکورہ ناول میں معاشرے کے مختلف طبقات کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے جیسے مسجد کا امام اور معاشرے کا اس کے ساتھ رویہ؛ اس کے ساتھ ساتھ بہو بیٹیوں کے فرائض اور ان کا معاشرے کے اندر مقام کہ کس طرح بیٹی کی پرورش کی جائے تاکہ وہ اگلے گھر جا کر اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو سکے اور اچھی شہری ثابت ہو سکے جس کو گھریلو اونچ نیچ کے پیشِ نظر صبر واستقامت کا درس دیا جاتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں آنے والی بہو اپنے سسرالی خاندان کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑتی؛ جو اپنے کردار اور اخلاق کی بدولت سب کو اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک کامیاب مشرقی بہو بیٹی کے متعلق حسن منظر لکھتے ہیں:

"مشرقی گھر میں نئی آنے والی بہو اور بھابھی سے کنبہ مضبوطی سے جڑا ہوتا ہے، بڑی توقعات ہوتی ہیں۔ وہ گھر بھی چلا سکتی ہے اور ہر ایک کا کام بھی کر سکتی ہے۔ نہ اس کا جسم تھکنا جانتا ہے نہ اس کا دماغ مضمحل ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت سسر، جیٹھ، جٹھانی، نندوں اور سب کے بچوں کو خوش رکھنا جانتی ہے۔"(۹)

مذکورہ ناول میں حسن منظر نے دیہاتی معاشرت کی بھرپور عکاسی کر کے دیہاتیوں کی زندگی پر تفصیل سے بات کی ہے؛ انھوں نے بتایا ہے کہ دیہات کے اکثر لوگ اپنی نمود ونمائش کے لیے کس طرح اپنے پیسے کا ضیاع کرتے ہیں اور اپنا بہت سا قیمتی وقت جانوروں کی لڑائیوں میں صرف کر دیتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر استطاعت سے زیادہ بے دریغ دولت کا ضیاع کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مشرقی دیہاتی عورتوں پر بات کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ جہاں پر گھر کی چار دیواری کے اندر رہنے والی باپردہ خواتین جن کے مرد باہر گلچھڑے اڑاتے ہوں زندگی کی مشکلات کے سامنے دیوار بن جاتی ہیں۔ ایسے معاملات کو نہ صرف نظر انداز کرتی ہیں بل کہ اغماض سے بھی کام لیتی ہیں اور اہلِ خانہ کی خدمت گزاری کو اپنا فرض سمجھ کر نبھاتی ہیں اور اسی معاشرت میں بہن بھائی کا رشتہ بھی عجیب ہے۔ بہنیں بھائیوں پر جان نچھاور کرتی ہیں تو وہ بھی ان کی عزت وناموس کی خاطر اپنی جان تک لڑا دیتے ہیں۔ اگر بہن کی شادی کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو بھائی محنت کرتے ہوئے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ اگر بہنیں سسرال میں کسی پریشانی میں مبتلا ہوتی ہیں تو ان کے گھر بسانے کی خاطر بھائی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے پاکستانی معاشرے میں بھائی بہن کا یہ

مقدس رشتہ تمام تر خوشیوں سے لبریز ہے۔بہن اگر بیمار ہے تو بھائی اس کی خاطر ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتا ہے؛ایسے ہی خیالات کا اظہار حسن منظر اپنے ناول میں کرتے ہیں:

"وہ عائشہ کو لے جانے کے لیے تیار تھااور اس کے ساتھ وہاں رہنے کو بھی رات دورات،ہفتہ بھر اور ستارہ جانتی تھی کہ وہ ایسا بخوشی بغیر کھائے پیے کر سکتا تھا۔"(10)

پاکستانی معاشرت میں (سوائے چند ایک کے) مغرب کی سی بے باکی نہیں ہے بل کہ یہاں پر تقریباًہر کام میں مشرقی روایات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔اپنے ہوں یا غیر کسی کی عزت اچھالنے سے گریز کیا جاتا ہے۔مصنف لکھتے ہیں کہ بعض اوقات نو عمری میں ہی ہونے والی محبت میں کئی واقعات رونما ہو جاتے ہیں جن میں سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکام ہوتے ہیں لیکن حیا کا پہلو نمایاں رہتا ہے؛ اس کی بدنامی کو اپنی بدنامی سمجھا جاتا ہے بعض اوقات بغاوت کا سوچا جاتا ہے لیکن سماج آڑے آجاتا ہے؛ایسی ہی ایک ملاقات کو حسن منظر نے تو یوں بیان کیا ہے:

"اوران کے کہنے پر کہ یہاں کوئی رمضان نہیں رہتا تو وہ ذرا بلند آواز سے کہے گا۔معاف کرنا مجھے رمضان سے کام تھا،تمھیں تکلیف دی،میرا نام احمد بخش ہے۔رمضان نے مجھ سے ایک کتاب لی تھی؛وہ مانگنے آیا ہوں۔یہی گھر بتایا تھا کونے سے تیسرا۔یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑے گا۔"(11)

معاشرے کے اندر عورت؛ماں،بیٹی،بہن،بہو،بیوی غرض یہ کہ تمام رشتوں میں اس کے مقام کو اجاگر کیا ہے۔اس ناول میں عورت کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلامی اقدار سے عاری معاشرے میں عورت کبھی کسی نشئی کے چنگل میں پھنس جاتی ہے تو کبھی ہوس کے لیے اس کا سودا کیا جاتا ہے۔ کہیں پر اسے بلیک میل کیا جاتا ہے تو کہیں اسے مارا پیٹا جاتا ہے۔اکیلی عورت اس معاشرے میں عدم تحفظ کا شکار ہے اگر وہ کوئی ملازمت کر رہی ہے تب بھی وہ اکیلے نہ تو سکول میں ٹھہر سکتی ہے اور نہ ہی کسی اور مقام پر۔

ہر معاشرے میں اچھے اور برے ہر دو طرح کے انسان بستے ہیں اسی طرح پاکستانی معاشرے میں بھی بروں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو صرف اپنے رب کی رضا کے لیے کام کرتے ہیں؛انہی اچھے لوگوں کی خدمات کے عوض بہت سے کام چل رہے ہیں؛انھی کی بدولت ہی غریبوں کے بچے پڑھ رہے ہیں۔احمد بخش ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے جو اپنے ارد گرد برائیوں کو دیکھتا ہے۔وہ

ان ناانصافیوں کو دیکھ کر بیرونِ ملک جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہاں پر اس کی اپنی شناخت ختم ہو گئی ہے لیکن جب وہ امریکہ چلا جاتا ہے تو اسے اپنے ملک کی یاد ستانے لگتی ہے۔ حسن منظر لکھتے ہیں:

"امریکہ آنے کے بعد شروع کے دنوں میں اسے اپنے چھوڑے ہوئے ملک کی ہر چیز کی یاد تنگ کر رہی تھی۔ گلی کوچوں تک؛ وہ کیچڑ جس میں بطخیں تیرا کرتی تھیں اور خوانچے والے جن کی کھلی ہوئی چیزوں پر گرد اور مکھیاں بیٹھی رہتی تھیں؛ جن سے وہ کبھی خرید کر نہیں کھاتا تھا؛ تعجب ہے اب اسے نہ ان چیزوں سے نفرت محسوس ہوتی ہے نہ گھن۔"(12)

حسن منظر کا تیسرا اور اہم ناول "انسان، اے انسان" ہے؛ جس میں انسان کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ انسان بھی کیا چیز ہے؟ وہ اپنے آپ کو کتنا بہادر سمجھتا ہے لیکن نفس کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ کلمہ گو مسلمان سجدہ تو اپنے خدا کے سامنے کرتا ہے لیکن گڑگڑاتا انسانوں کے سامنے ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار تلمیذ ہے جس کی زندگی متنوع قسم کے واقعات پر مبنی ہے۔ مصنف نے بہت باریک بینی سے مختلف معاشرتی پہلوؤں پر بات کی ہے۔ تلمیذ کے کردار کے ذریعے وہ عمر کے ہر دورانیے کا نفسیاتی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ابتدائی عمر میں بچے کا دماغ ناپختہ ہوتا ہے وہ چوں کہ اچھائی برائی کی تمیز نہیں کر سکتا اس لیے اگر اسے غلط کاموں کی لت پڑ جائے تو وہ زندگی بھر بار بار انھیں دہراتا رہتا ہے؛ پھر اس طرح معاشرتی پابندیوں سے ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے اور یوں وہ باغی بن جاتا ہے لیکن اس سب کے پیچھے کچھ معاشرتی رویے ہوتے ہیں جو اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار مختلف سماجی مراحل سے گزرتا ہے۔ شراب، جوا، فحش کاری اس کے لیے عام سی چیزیں ہیں۔ بہت سی عورتیں اس کی زندگی میں آتی ہیں۔ وہ اکثر یہ سوچتا ہے کہ نوجوانی کے اوائل میں تسنیم نامی عورت جو اس کی تایازاد تھی؛ اگر اسے مل جاتی تو جگہ جگہ اسے منہ نہ مارنا پڑتا۔ ایسا شخص جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی لیا ہو وہ کسی ایک ہی جگہ پر نہیں رہ سکتا بل کہ تمام زندگی بھاگتا ہی رہتا ہے۔ زندگی کے ایک موڑ پر تلمیذ کی ملاقات نصرت اور اس کے خاوند سے ہو جاتی ہے اور جس طرح وہ خوش طبعی اور اچھے اخلاق سے اس سے پیش آتے ہیں تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ

کاش میرا باپ بھی میرے ساتھ ایسے ہی پیش آتا تو شاید وہ زندگی میں کبھی گمراہ نہ ہوتا۔ حسن منظر یوں لکھتے ہیں:

"ایک دن تھا کہ باپ نے گھر سے نکالا تھا۔ پھر وہ دن آیا بہن بہنوئی نے گھر سے نکال دیا۔ ان سے یہی لوگ اچھے ہیں کہ رہنے کو جگہ دی۔"(13)

اکیسویں صدی کے اہم ناول نگاروں میں مستنصر حسین تاڑر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مستنصر حسین تاڑر ۵۰ سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں ناول، کہانیاں، افسانے وغیرہ شامل ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آنے والا ان کا ناول "خس وخاشاک زمانے" اکیسویں صدی کے اہم ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ناول بھی ضخیم ہے اگرچہ اس میں صدیوں کا تو بُعد نہیں ہے لیکن کم از کم تین نسلیں ہمارے سامنے پروان چڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک نسل کے کام اور فیصلوں کا دوسری نسل پر اثر ہوتا ہے؛ ہر نئی زندگی کا دریچہ کھلتا ہے۔ مصنف اس ناول میں زندگی کے نئے نئے رجحانات اور نئی نئی جہتوں سے روشناس کراتا ہے۔ گاؤں کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ گاؤں میں بہت سی ایسی بے سہارا عورتیں ہیں جن کا گزارا مرغیوں کو پال کر ہوتا ہے۔ اس ناول میں زمینوں کے جھگڑے، غریبوں کا استحصال، لالچ میں آکر اپنوں کا خون سفید ہو جانے کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ مذکورہ ناول میں بخت جہاں اپنے سگے بھائی جان محمد کی زمین پر زبردستی قبضہ کرلیتا ہے کیوں کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں صرف بیٹیاں ہی ہیں۔ کہانی میں لاقانونیت کا ہر جگہ راج دکھایا گیا ہے۔ اس ناول کی اہم خصوصیت مکافاتِ عمل ہے اگرچہ قانون بدلہ نہیں لیتا لیکن قدرت ضرور بدلہ لے لیتی ہے۔ اس ناول میں معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کے ساتھ ساتھ عدلیہ کے نظام کی خرابیوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے جہاں دیوانی مقدمات لڑتے لڑتے انسان اپنی زندگی ہار جاتا ہے۔ مقدمات دادا سے پوتے تک منتقل ہو جاتے ہیں لیکن ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ متنازعہ رقبے کی قیمت سے دوگنا اس کے مقدمے پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اپنی طاقت اور اثر ورسوخ کے زور پر بھائی بھائی کی زمین پر قبضہ کرلیتا ہے؛ ایسے ہی ایک واقعہ کے متعلق مستنصر حسین تاڑر بیان کرتے ہیں:

"جب وہ اس گھوڑی پر سوار ہو کر؛ ایک مرد ہو کر؛ اپنی ڈانگ لہراتا؛ دنیا پور میں نکلتا تو خدائی سہم جاتی ہے۔ وہ انھیں ماؤں بہنوں کی گالیاں دیتا اپنی

زمینوں تک جا پہنچتا جو کبھی اس کے بھائی جان محمد کی ملکیت ہوا کرتی تھیں اور اب اس کے ہل ان زمینوں پر چلتے ہیں۔"(14)

پاکستان بننے کے بعد بخت جہاں کے سکھ دوست واپس ہندوستان چلے جاتے ہیں تو اس کا عروج زوال میں بدل جاتا ہے۔ مفلسی اسے گھیر لیتی ہے کیوں کہ مکافاتِ عمل ناگزیر ہے۔ زمانوں پر محیط یہ ناول جدید اور قدیم زمانے کے واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس ناول میں گھریلو جھگڑوں سے لے کر بین الاقوامی مخاصمت تک ہر طرح کا ذکر ملتا ہے۔ عورت کی عورت دشمن ہے۔ کس طرح ماہو کی سوتن اس کو زہر دے کر راستے سے ہٹا دیتی ہے؟ اپنی حسد کی آگ بجھانے کے لیے اور پھر آخر کار خود بھی پاگل ہو کر مر جاتی ہے۔ اگر ہم آج سے بیس تیس سال پیچھے چلے جائیں تو آج کے دور کی بہ نسبت سادگی عام تھی؛ معاشرتی رکھ رکھاؤ زیادہ تھا۔ دوسروں کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھا جاتا تھا۔ کسی کی بیٹی کو اپنی بیٹی تصور کیا جاتا تھا؛ اگر کسی کی بیٹی کی بارات گاؤں میں آتی تو ہر کوئی خدمت کے لیے پیش پیش ہوتا تھا اور اس گاؤں کا ہر گھر دلہا کو اپنا داماد تصور کرتا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"ان زمانوں میں جب گاؤں میں کوئی بارات اترتی تھی تو صرف اسی گھر میں نہ اترتی تھی۔"(15)

ناول کا اختتام رجائیت پر کیا گیا ہے حالاں کہ مذکورہ کہانی میں انسان انتہائی مایوسی کی حدوں کو چھوتا ہوا ناامیدی کے کناروں سے ہو کر لوٹتا ہے۔ تاریخی ہچکولوں کو مصنف نے بڑی چابک دستی سے رقم کیا ہے جو فنی پہلوؤں سے عبارت ہے۔ تقسیمِ ہند سے شروع ہو کر گیارہ ستمبر 2019ء کے واقعات تک محیط یہ ضخیم ناول دیہاتی، شہری اور یورپی تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

اکیسویں صدی میں تخلیق ہونے والا مستنصر حسین تارڑ کا ایک اور ناول "قربتِ مرگ میں محبت" ہے جو پاکستانی معاشرت کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے؛ ویسے یہ ناول کسی ایک موضوع کے متعلق نہیں بل کہ مختلف طرح کی کہانیاں اس کے اندر سمو دی گئی ہیں۔ مشرقی خاندانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں کی سلیقہ شعار خواتین صبر و استقامت کے ساتھ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا جانتی ہیں۔ صابر و شاکر پاکستانی اسلامی معاشرے کی خواتین اپنے بچوں کی پناہ گاہ ہوتی ہیں اور ان کے اچھے مستقبل کے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے ان کے بہترین مستقبل کی خاطر خاوند کی اجازت کے بغیر دہلیز کے باہر قدم تک نہیں رکھتیں۔ اس کے برعکس یورپی ممالک میں عورتیں اور بچے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں کیوں کہ ان کی تربیت اسلامی اقدار کے مطابق

نہیں ہوئی ہوتی۔ یورپی ممالک کی طرح مشرقی اور اسلامی ممالک میں عورت کلبوں کی باندی نہیں ہے کیوں کہ اسلامی معاشرے میں باپ، بیٹا، بھائی، خاوند اس کی عزت کے رکھوالے ہوتے ہیں مستنصر حسین تاڑر کے اس ناول میں مختلف قسم کے کردار چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں؛ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ اپنا ملک ہم نے جس نظریے پر حاصل کیا تھا آج ہم اس سے روگردانی کررہے ہیں۔ آج ہمیں پاکستانی برانڈ پر فخر نہیں۔ہم نے غیر ملکی آقاؤں سے آزادی تو حاصل کرلی ہے لیکن ذہنی طور پر ہم اب بھی ان کے غلام ہیں۔ مصنف نے انڈیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ آج ہم دوسروں کو دکھانے کے لیے اپنی گاڑیوں پر کرش انڈیا لکھواتے ہیں لیکن اس خیال کے برعکس شادی بیاہ میں بل کہ اور بھی بہت سی رسموں میں ان کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ مستنصر حسین تاڑر لکھتے ہیں:

"وہ لوگ جو "کرش انڈیا" کے سٹیکر لگائے پھرتے تھے؛ شادیوں پر تیل مہندی اور دیگر شگن کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے"(16)

اقربا پروری، ایلیٹ کلاس کے اندر پائی جانے والی قباحتیں، امیروں اور غریبوں کے درمیان پایا جانے والا تفاوت، مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا فرق اور ان میں موجود خامیوں کا ذکر مصنف نے بڑے بااحسن انداز میں کیا ہے۔

"ڈاکیا اور جولاہا" مستنصر حسین تاڑر کا ایک اور اہم ناول ہے جو 2008ء میں شائع ہوا۔ 304 صفحات پر مشتمل اس ناول کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ یہ ناول بھی دیہی زندگی کے ماحول کے گرد گھومتا ہے۔ "قربتِ مرگ میں محبت" اور "ڈاکیا اور جولاہا" میں کچھ حد تک مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ "قربتِ مرگ میں محبت" میں ایک ادھیڑ عمر مرد اور تین عورتوں کے کردار ہیں؛جب کہ "ڈاکیا اور جولاہا" میں چند اور کرداروں کے علاوہ ایک سید ذات عورت کا تذکرہ ملتا ہے جو شرم وحیا کی پیکر ہے لیکن مصنف اس ناول میں کچھ زمینی حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے کہ مرد اپنی پختگی کی عمر میں کوئی بھی اچھا برا قدم اٹھانے سے پہلے کئی بار سوچتا ہے۔ خاندانی پس منظر، روایات، پس پشت ڈال کر عورت باغی ہو کر اگر حد پھلانگنے پہ آجائے تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی؛اس ناول میں مصنف نے عورت کی جنسی اور نفسیاتی کیفیات کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مذکورہ ناول میں جہاں پاکستانیت کے جملہ پہلوؤں سے پردہ اٹھایا گیا ہے وہاں مغربی معاشرت کی کج رویوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ناول کا کینوس پاکستانی دیہات سے شروع ہو کر یورپ تک پھیلا

ہوا ہے۔ مصنف نے غریب لوگوں کی زندگی کا انتہائی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے کہ گاؤں میں گھر کے اندر کھڈیوں پر کام کرنے والے جولاہے جو کہ ساری ساری رات دیے کی لو پر اپنا کام کرتے ہیں تب بھی ان کو بڑے لوگوں کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ان کے کام میں نقص نہ نکال دیں اور اگر چودھریوں کو ٹھیک طور پر کام کر کے نہ دیا تو وہ ان کا حقہ پانی بند کر دیں گے غریبوں کے لیے دو وقت کی روٹی پورا کرنا بھی جان جوکھوں کا کام ہے؛ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"گاؤں کی منجمد رات کے اترتے ہی نائی، دھوبی، ترکھان، لوہار، ماچھی جولاہے۔۔۔۔۔ دن بھر کی مشقت کی بدن توڑ تھکاوٹ میں چُور اپنے دیے کی لو نیچی کر دیتے تھے کہ ان کے پاس رات دیکھنے کو کچھ نہ ہوتا تھا۔"(17)

ہمارے معاشرے میں کچھ پیشے ایسے ہیں جن کو حقیر سمجھا جاتا ہے حالاں کہ ان کے بغیر معاشرے کا وجود ممکن نہیں؛ دیہات میں ان کو کمی کمین کہا جاتا ہے حالاں کہ زندگی کے بنیادی کام انھی کے ذمے ہوتے ہیں؛ اس کے باوجود ان کی ساری زندگی مفلسی میں گزر جاتی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ جوں جوں معاشرہ ترقی کر تا جارہا ہے معاشرتی تہذیب و تمدن کو خطرات لاحق ہوتے جارہے ہیں۔ ہر چیز کے دو پہلو ہیں تاریک اور روشن؛ جب کالجوں، یونی ورسٹیوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا گھروں میں باپردہ بیبیاں بچیوں کی تعلیم کا اہتمام کرتی تھیں؛ ان کے اندر مثبت سوچ کو پروان چڑھاتی تھیں۔ اچھے بڑے کی تمیز، اپنے مذہب سے واقفیت مقصدِ حیات کو اجاگر کرتی تھیں۔ اگرچہ جدید دور کے ساتھ چلنا ناگزیر ہے لیکن اس جدت کی بدولت ہی یونی ورسٹیوں کا ماحول، انٹرنیٹ، موبائل کے غلط استعمال کی وجہ سے گھر والوں کو خبر تک نہیں ہوتی اور گیم ہو جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ رقم طراز ہیں:

"یہ ایک روٹین بن چکی ہے۔ اس میں کوئی خدشہ نہیں، کوئی خطرہ نہیں۔۔۔ ہوسٹلوں میں رہنے والی کچھ لڑکیاں، ورکنگ وومن، یونی ورسٹی ہوسٹلز یا کالج کے ہوسٹلز میں رہنے والی کچھ لڑکیاں گیم ہوتی ہیں۔"(18)

بیرونِ ممالک جانے والوں کی اولادیں بعض اوقات اپنی تہذیب اور اپنی روایات سے باغی ہو جاتی ہیں؛ نہ وہ دین کے رہتے ہیں نہ دنیا کے مغربی لٹریچر کے بُرے اثرات نسلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مذکورہ ناول میں مصنف بتاتے ہیں کہ ایک سید ذات عورت کا دماغ مغربی سکول میں پڑھنے سے خراب ہو جاتا ہے اور وہ صلیب پہننا شروع کر دیتی ہے اور ایک غیر ملکی لکھاری سے محبت کرنا شروع

کر دیتی ہے۔ مستنصر حسین تاڑر نے اس ناول میں اچھوتے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔مصنف نے جہاں مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہاں مغربی معاشرے کی کج رویوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو اخلاقی گراوٹ آرہی ہیں اس کا بھی عندیہ دیا ہے۔

اکیسویں صدی میں لکھا جانے والا ناول "حاصل گھاٹ" 2006ء میں منظر عام پر آیا تھا؛اس میں فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے یہ ایک فلسفیاتی قسم کا ناول ہے؛اگرچہ ناول ضخیم ہے لیکن اصل کہانی مختصر ہے۔ بہت لمبی لمبی تاویلیں اور حوالے دیے گئے ہیں؛البتہ داخلی انسانی کرب کو بہت اچھے انداز سے سمیٹا گیا ہے۔ مشرقی اور مغربی روایات کا جگہ جگہ موازنہ کیا گیا ہے۔ مثلاً پاکستانی معاشرے میں خاندان کا ایک فرد سربراہو تا ہے؛گھر کا ہر فرد اس سے مشورہ کرکے ہی اپنا کوئی بھی کام شروع کرتا ہے۔اس ناول میں مشترکہ خاندانی نظام کی خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے۔اس ناول میں مصنف نے ماضی کے جھروکوں سے حال کو تراشنے کی سعی کی ہے۔ناول کا اختتام ایک المیہ پر ہوتا ہے یعنی ایک ایسی محبت جس کی کوئی منزل نہیں علاوہ ازیں یہ ناول ہمیں سمندر پار پاکستانیوں کی مشکلات سے بھی آگاہی دیتا ہے۔

اکیسویں صدی میں منظر عام پہ آنے والا مظہر الاسلام کا ایک منفرد ناول "باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی" ہے۔انھیں ادب میں پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ دیا گیا؛انھوں نے اپنی تحریروں میں متنوع موضوعات کو سمویا ہے۔عام کلرک اور چپڑاسی سے لے کر محبت کے لیے بھٹکنے والے آزادی کے متوالے اور سماجی و سیاسی موضوعات ان کی تحریروں کا حصہ ہیں۔مصنف نے مذکورہ ناول میں بتایا ہے کہ تمام انسان حضرتِ آدمؑ کی اولاد ہیں؛پھر قبیلے،بستیاں،شہر بس گئے کوئی غریب،کوئی امیر بن گیا۔یہ صرف قدرت کا نظام ہے؛جسے چاہے نواز دے لیکن ہمارے معاشرے کا المیہ ہے غریب؛غریب سے غریب تر اور امیر؛امیر سے امیر تر ہوتا جارہا ہے۔اگر کوئی جمعدار ہے تو بچے بھی اسی پیشے کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔گھروں میں کام کرنے والوں کی اولادیں بھی وہی کام کرتی ہیں۔ ہر گھر کی ایک کہانی ہوتی ہے بعض اوقات غربا کو سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔حتیٰ کہ غریبوں کے برتن بھی مخصوص اور الگ کر دیے جاتے ہیں۔اسی حوالے سے مظہر الاسلام لکھتے ہیں:

> "آپ کو تو پتہ ہی ہے حضور ہم جن گھروں میں کام کرتے ہیں وہاں ہمارا برتن الگ ہوتا ہے جو عام طور پر ڈیوڑھی میں بجلی کے میٹر کے ڈبے کے اوپر رہتا

ہے اور جب گھر سے کھانے کی کوئی چیز ملتی ہے تو ہم اپنا برتن استعمال کرتے ہیں۔"(19)

غربا کو صرف دو وقت کی روٹی کے لیے اپنے نفس کو مار کر کس قدر جدوجہد کرنا پڑتی ہے؟ یہاں تک کہ کچھ گھروں میں ان کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں عدل وانصاف سے کام نہ لیا جائے وہ معاشرہ گھٹن زدہ معاشرہ بن جاتا ہے جس میں سانس لینے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ اگر معاشرے سے عدل وانصاف اٹھ جائے تو ہر چیز کا سودا ہونے لگتا ہے چاہے کسی کی عزت ہی کیوں نہ ہو؟ جہاں گواہ تک خرید لیے جاتے ہوں وہاں عدل و انصاف کیسا؟۔ لیکن مصنف اچھے مستقبل سے پر امید ہے ابھی معاشرے میں ایسے لوگ بھی باقی ہیں جو مثبت سوچ اور راست گوئی کی بدولت دوسروں کے لیے سہارا بنے ہوئے ہیں۔ المختصر 150 صفحات پر مشتمل یہ ناول اپنے اندر مختلف کہانیوں کو سموئے ہوئے قاری پر بہت سے سوالات اور اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔

2010ء میں نجمہ سہیل کا شائع ہونے والا ناول "اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے" ہے؛ جس کا مرکزی کردار عفت ہے۔ اس میں مصنفہ نے پاکستانی معاشرت کے زیرِ اثر انسانی رویوں پر بات کی ہے۔ علاوہ ازیں اکیسویں صدی میں رضیہ بٹ کا آنے والا اردو ناول "قربان جاؤں" بھی ہے جو 432 صفحات پر مشتمل ہے جس میں پاکستان کے مشترکہ خاندانی نظام کی افادیت اور پاکستانی معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے ان کے بیشتر ناولوں میں نسوانیت پائی جاتی ہے؛ وہ اس لیے کہ انھوں نے زیادہ تر ناول عورتوں کے مسائل اور سماج کے متعلق لکھے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ مسیح الزماں، ڈاکٹر، "ناول کی تنقید"، شب خون، مارچ 1967ء، ص:۵

2۔ عابد علی عابد، سید، "اصولِ انتقادِ ادبیات، مجلسِ ترقی ادب لاہور"، ص:498

3۔ مبارک علی ڈاکٹر "پاکستانی معاشرہ" تاریخ پبلی کیشنز، بک سٹریٹ:39، مزنگ روڈ، لاہور، 2012ء، ص:10

4۔ اطہر بیگ، مرزا "غلام باغ" سانجھ پبلی کیشنز لاہور، 2015ء، ص:21

5۔ ایضاً، ص:179

6۔ اطہر بیگ مرزا "حسن کی صورت حال" سانجھ پبلی کیشنز لاہور، 2015ء، ص:32

Mirza Ather Baig,Interview,the news، 10 June ،2014

7۔ Sunday

8۔ حسن منظر،"وبا"(ایک بیانیہ)شہزاد پبلشرز کراچی،2009ء،ص:۱

9۔ حسن منظر،"دھنی بخش کے بیٹے،،شہزاد پبلشرز کراچی،2008ء،ص:58

10۔ ایضاً،ص:92

11۔ ایضاً،ص:95

12۔ ایضاً،ص:295

13۔ حسن منظر،"انسان اے انسان"،شہزاد پبلشرز کراچی،2013ء،ص:52

14۔ مستنصر حسین تاڑر،"خش وخشاک زمانے"سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،2010ء، ص14

15۔ ایضاً،ص:17

16۔ مستنصر حسین تاڑر،"قربت مرگ میں محبت"سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،2005 ء،ص:80

17۔ مستنصر حسین تاڑر،"ڈاکیا اور جولاہا"سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،2005ء، ص:47

18۔ مستنصر حسین تاڑر،"ڈاکیا اور جولاہا"سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،2005ء، ص:86

19۔ مظہر الاسلام،"باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی"لیو بکس،اسلام آباد،2014ء، ص:۲